

”جھنپھٹ!“ ذوالفنار بولا۔ پھر اُس نے نیم اندھیرے میں اتھ پھیلانے ” اور یہ کیا ہے؟“ اُس نے رو مال والے اتھ سے فضلے کے بڑن کی طرف اشارہ کیا ، ” اور یہ چھٹے؟“ اُس نے بکل کا کونا اسد کے کندھے سے اٹھایا ، جیسے اُس کو اپناہی ننگا بدن دیکھنے کی دعوت دے رہا ہو ۔ اور یہ چھٹے بہاں کالی کوٹھری میں غلط میں نیٹھے لا یعنی طور پر کہے جا رہے ہو میں گواہ ہوں ، میں گواہ ہوں ۔ صرف یہی نہیں کہ تم ایک خطرناک جھنپھٹ!“

اُس نے لفظ پر زور دے کر کہا ، ” میں پھٹے ہو ، بعد تم ایک تیدی ہو۔ ایک گناہ قیدی ہے : ”

” میں علاج کرنے والے بہاں آیا ہوں ۔“ اسد نے کہا ، ” میرا اور کوئی کام نہیں ۔“

” اور اب کس سے علاج کراؤ گے؟“ وہ تو مرگیا جو علاج کرتا تھا ۔ بہاں اس کوٹھری میں تمہارا علاج کرنے کوں آئے گا؟ اور یا سیمن گھل؟ اُس کی شکل تک تم نہیں دیکھ پاؤ گے ۔ تمہارا اُس سے تعلق ہے ۔ تمہارا دل نہیں کرتا کہ اُس سے جا کر ملو ہے؟“

” یا سیمن میری گواہ ہے؟“ اسد نے کہا ، ” وہ میری گواہی دے گی ۔ اُس کا نام گھل یا سیمن ہے ۔“

” کیا لا یعنی باقی کر رہے ہو ۔ نام یہ ہے ۔ تم گواہ ہو ۔ وہ گواہ ہے ۔ ذوالفنار ناگرا رس سے بولا؛“ تمہارا خیال ہو گا کہ تمہیں یا سیمن گھل کی ایسی بائی میر رہے ہے اُس کی حقیقت بھی میں نہیں بتا دیتا ہوں ۔ تم دونوں نے جھوٹ بول رہے ہیں ۔“

” کیا جھوٹ بولا ہے؟“

” یا سیمن گھل نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ جب تم نے آدھی رات کے وقت مطب میں روشنی و بیکھی تو وہ تمہارے ساتھ تھی ۔ اُس وقت تم درون شرقی میدان کی جانب سے واپس آ رہے تھے ۔“

” ہاں ۔“

” اس بیان سے تم دونوں نے یہ اثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا تم ایک ساتھ مطب میں داخل ہوئے اور وہاں حکیم کو مردہ پایا ۔ مگر یہ بات غلط ہے ۔ غلط ہے یا نہیں؟“

اسد حواب دینے کی بجائے مذہب اٹھائے تھے دیکھتا رہا ۔

” حقیقت یہ ہے کہ یا سیمن گھل اس درستے کہ اُس کے باپ کو تم دونوں کی خیفرہ ملقاتوں کا عالم نہ جو جائے ، اُس بھروسے سیہی گھر جاگ گئی جب کہ تم داں سے ایکے مطب میں گئے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت مطب میں سوائے تمہارے اور حکیم کے ۔ یا حکیم کی لاش کے ۔ کوئی میراً دمی نہ تھا ۔ بعد میں تم نے جا کر یا سیمن گھل کر قتل کی اطلاع دی ۔“

اسد حیرت زدہ پیٹھا ذوالفقار کو دیکھ رہا تھا۔ ”اپ میرے بیچے گشہ جا پکھے ہیں ہے“
”میرے جانے یا نہ جانے سے کیا ہوتا ہے۔ تفتیش میں سب کچھ نکل آتا ہے۔ تمہاری ایسی بائی ناکارہ
ہر جگہ ہے۔“

اسد سوچ رہا تھا، یا سبھن اتنی احمق نہیں ہر سکتی، وہ پوچھ گچھ کے دران اپنے بیان کو بدل نہیں سکتی، چھ جائیکہ ایک غلط بیان کو دوسرا سے فلٹر بیان سے بدل دے۔ بہنا ممکن ہے۔ پھر کس نے یہ بات بنائی ہے۔ نہ مرسنی ہے دل ہے کون ہو سکتا ہے ہے اسد کی دلیل جواب دے گئی تھی، مگر ایک بات اُس کے دل میں اُسی کی اُسی طرح نہ کھڑی تھی ۔۔۔ کروہ بے گناہ ہے۔ ان بالتوں سے کوئی فرق نہیں ڈرتا۔ اُسے کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ کرنے والے ہے۔

نگر کس طرح ہے زوال الفقار برابر سواں پر نظر وہن سے قیدی کو رکھئے جا رہا تھا۔ اسد کا بہ اس اجنبی سے، اس کی باتوں کی عدم فہم دلیل سے، ان کی ناقابل تردید سچائی سے خوف آنے لگا تھا۔ اس انخجال سے خوف نے اس کے دل میں مدافعت پیدا کی، وہی پرانی مدافعت جس کا وہ اب عادی ہو چلا تھا، جیسے کہ یہ مدافعت، یہ دیوانگی اس کی آخری پیادگاہ ہو۔

”میں کسی نہ کسی طرح بیان سے نکل جاؤں گا۔“ اُس نے کہا۔

”کیسے مخل جاؤ گے ہے“

”کسی نہ کسی طرح میں نکل جاؤں گاؤں۔“ اسد نے دہرایا، ”یہاں شاہ رُخ میرا درست ہے بھٹی سے
داپس ہمگرد کچھ دکھ کے گا۔ کسی دیپل سے اگر رابطہ ہو سکے تو میں یہاں سے نکل سکتا ہوں۔“

” قتل کے ملزم کی کوئی دکیل ضمانت نہیں کر سکتا۔ اور دکیل آنے کا کہاں سے ہے شاہ گرخ سرکاری ملازم ہے۔ قتل کے ملزم کی طرف داری کا خطرہ مول نہیں سے سکتا۔ اس کے علاوہ تمہارا صرف ایک علیم چھپا ہے۔ اس سے تمہاری تھوڑی بہت خط و کدا بست ہے۔ اس کو خبر بھی نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ہر کوئی جانے نہ کر سکے۔ اس قابل نہیں کہ بہماں تک تمہارا بیچھا کر سکے۔ اور تمہارا کوئی لفڑی نہیں۔ نہ ماں نہ باپ۔ نہ بہن نہ بھائی۔“

اس مذہب اپنے خالی خالی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُسے بکھرنا آرہی تھی لہ کیا جواب دے۔
دو الفقار کا چہرہ کوٹھرمی کی سیاہ دیوار کی مانند بے جزا تھا۔ صرف انگھوں کے دوسرا خ دکھائی دے۔ ہے
تھے، جن میں اب پھر بے نام سی چمک پیدا ہو چلی تھی۔ اس کو محکومس ہوا کریں وہی انہمیں ہیں جو پر دے

کے پیچھے سے اور کبھی پرداہ اٹھا کر، دن رات اُس پر لگی رہتی ہیں۔ کوئی خُسری میں تعفن پھر خود کر آیا تھا۔ غصتے کی ایک بہراست کے دماغ کو چڑھنے لگی۔

”آپ یہری مدد کرنے آئے ہیں یا مترا دینے ہے؟“ اُس نے پوچھا۔

”مدد کرنے“ ذوالفقار بولا، ”حقیقت یہ ہے، اسد کریم، کہ یہرے علاوہ تمہارا کتنی پوچھنے والا نہیں۔ سوائے ایک خدا کے۔ وہ بات کرتے کرتے رک گیا، جیسے اُس کے ذہن میں کوئی نئی بات آئی ہو۔ قیدی کے چہرے پر نظر میں گماڑ کر دے بولا، ”تم خدا پر تقین رکھتے ہو؟“

اسد انہی خالی، لا جواب نظروں سے جبکی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے دوبار زنجیر والے ہاتھ کو کھینچا، جیسے انہیہرے میں کسی شے کو پکڑنے کی دشمنی کر رہا ہو۔

”خدا سے اس کا کیا تعلق ہے؟“ وہ چلنا کر بولا۔ ”میں نے کافی جرم نہیں کیا۔ میں انصاف طلب کرتا ہوں،“ وہ دونوں زنجیروں کو کھینچتا ہوا دعا مارا، ”النصاف؟“

ذوالفقار اس ناگہانی حملے پر بھٹک سا گیا۔ اُس کے چہرے پر عالیوسی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اُس نے ایک چھوٹا سا قدم پیچھے کی طرف اٹھایا، پیچھے کہنے کے لیے منہ کھولا۔ پھر ارادہ تبدیل کر دیا۔ اس کی بجائے اُس نے جگ کر لالیٹن اٹھائی اور تیری سے دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازے پر اُس نے اپنا ہاتھ سلانوں کے بیچ سے باہر نکال کر تالا گٹھے پر بھایا۔ پھرے دار سپاہی نے آگر دروازہ کھولا۔ پھر دروازہ کھٹاک سے بند ہوا اور پرداہ گر گیا۔

سن انہیہر اس طرح کوئی خُسری میں راست آیا جیسے مدت سے اور کبھی نہ دھرا ہو۔ قیدی تھر پر بیٹھا کھولی ٹھوٹی نظروں سے تاریکی میں دیکھتا رہا۔ اُس نے ناسف سے سوچا کہ باقی کرنے ہئے اُس نے دل میں ارادہ کیا تھا کہ جبکی کے جانے سے پہلے وہ ایک دار پھر اُس سے پیش اب والے بڑن کے بارے میں درخواست کرے گا۔ تعفن اُس کے دماغ میں کیل کی طرح گزرا ہوا تھا۔ ذوالفقار کے الفاظ اُس کے کافروں میں گزجھ رہے تھے۔ تمہارا کون ہے؟ ہے نہ مان نہ باپ، نہ بھائی نہ بہن..... تھے دفع میں آج ہیلی بار اپنی ہل مالت اُس پر اچاگر جوتی تھی؛ اُس کا کل رچنے والا نہیں۔ پھر بیاروں سے کھانا دینے والوں سے، نلاشی لینے والوں سے، نشاد کرنے والوں سے قیدی نے جو شستہ جوزا تھا اس جبکی نے اسے منقطع کر دیا تھا۔ اجنبی نے ایک قدر ادم شہزاد اُس کے آگے بکھر اسے اپنی شکل دکھائی تھی۔ اُس کا رشتہ کسی ذمی دن سے نہیں تھا۔ وہ ایک خلہ میں بیٹھا تھا اور اس خلار کے مرکز کے ساتھ بندھا جوا تھا۔ وہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہا، کوئی اُس کی آزاد نہیں

سُستا، کوئی جواب نہیں دیتا، کبھی کو اُس کی خبر نہیں۔ وہ دہاں پر موجود ہے مگر نظر دی سے او جسی ہو گیا ہے۔ اب یہاں روشنی کی ایک کلنگ داخل ہو گی۔ وہ اس کو خہری میں کیاہ و تہاہ ہے، کیاہ و تہاہ ختم ہو جائے گا۔ یہ اس کی صورت ہے۔

اسد۔ اسد کریم۔ اُس نے اپنے نام کو زیر لب دہرا دیا۔ وقت۔ وقت ہاتھ سے محل کر بھاگ گیا تھا۔ اُس سے محصور ہوا کہ وہ اسی کو خہری میں پیدا ہوا تھا۔ اسی کو خہری میں ہو جائے گا۔ دنیا اُس کے حالات سے بے خبر رہے گی۔ وقت ہاتھ سے چھٹ گیا ہے۔ اُس کا اتھ مُستقل رہنی زنجیر کو چھوٹے چھوٹے جھنکے دیے چارا تھا۔ ایک تاریک دیوار سے اُس کا رشتہ ابھی قائم تھا بہر حال — اس خیال سے اُس کے پدن کو کچھ قوتیت پہنچی۔ اُس نے آنکھیں مل مل کر انہیں سے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ اُس کے پیٹ میں ایک دیسیع خلہ پیدا ہو رہا تھا جس کے اندر درد کی ایک رُد چل رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو کپڑا کر آہستہ آہستہ اسے لئے رگا۔ اُس وقت دروازے کے باہر رات کی پہلی چین جلد ہوئی۔

یہ بیہت ناک آواز اُس کے دماغ میں گڑھی ہوئی میل پر تھوڑے کی طرح آکر گئی۔ اُس نے تیزی سے ایک کمبل رہنی ڈانگوں سے آتا را اور سر پر ڈال کر کالوں کے گرد اُس کے تین چار میل دیے۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھ کافروں پر رکھے اور سر کو گھسنے میں دبایا۔ انسانی اذیت کی چینیں اُس کے روئیں روئیں میں داخل ہو کر اُس کے پدن کو تھر تھرانے لگیں۔ اُس کا دماغ ددد کے مارے بدلنا شکا۔ اُس نے ایک جگہ جگہی لی اور زمین پر آ رہا۔ اُس کے پیٹ میں درد کا ایک طوفان اٹھا اور خارج ہو گیا۔

رفعت اُس کی بند انکھوں کے پیچے آوازیں اور مناظر ایس میں گزندہ ہو کر ٹھہر گئے۔ اُس کے دماغ میں شیشے کا کعب برف کی سل میں تبدیل ہونے لگا، سردا اور سُن اور پریکرت بچکدار۔ وقت کی رفتار بدھنی۔ ہر چیز غیر قادری رفتار سے حرکت کرنے لگی۔ جیسے خواب میں کرتی ہے — بہت تیز یا بہت دھیمی۔ مگر دخاب کی حالت میں نہ تھا، اتنا اُس سے علم تھا۔ سرفت اپنے اندر سے سکل کر جو ہو گیا تھا۔ اُس برف کی سل میں سے ایک چڑا عکودھی رہستہ نہوار ہوا جس پر تیز رعنی پر رہی تھی۔ اُس راستے نے باہر سکل کر ایک چڑھی سفید پی کی شکل میں اُس کے گرد پہنچا شروع کر دیا۔ تھوڑی بی دیر میں اُس پی نے سکل طور پر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب یہاں سکل سکرت تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو اُس خول کے اندر، اسی طرح کافروں پر ہاتھ رکھے، لگھتے چھاتی سے رکانے، پہلو کے بل زمین پر پیسے ہوئے دیکھا۔ اُسے پتا تھا کہ اُس کے پیٹ میں درد کا طوفان تھم چکا ہے اور پنحوں کی آواز بہت دور سے آرہی ہے، مگر وہ اپنے خول میں محفوظ پڑا ہے۔ اُس کو مزید علم تھا کہ کچھ چیزیں ہاتھ سے چھٹ

گھنی ہیں۔ مثلاً بادشاہی تھا۔ اُس کی یاد کی گدرا، وانے دار عجیق سلطح جس پر اب تک اُس کی گرفت مضمون رہی تھی اب اس برف کی سخت پھسلوں سلطح بن گئی تھی جس پر پائیں جتنا تھا نہ تھا۔ اُس کی زندگی ممکن تھے ممکن تھے ہو کر آگے پیچے، گرتی پڑتی اور اڑتی ہوئی گزر رہی تھی۔ وہ بے دم پڑا اس کے دھاروں میں بکھلنا اور داخل ہوتا رہا۔ اس چڑھے رکشیں راتے کا سر انظر نہ آتا تھا۔ کہیں کہیں تاریک فربنگیں پینی تھیں جن سے وہ ہوا کی تیزی سے اڑتا ہوا گزر جاتا، پھر جب دھرپ میں بکھلنا تو بازوں کھول کر آرام سے نصایں تیرنے لگتا۔ کبھی اُس کے مکروں کا جلوں چلتا، کبھی وہ خود بکھلا ہو کر، شے پر پندے کی ماند ٹوٹی پھوٹی مٹی ہوئی جگہوں کے اور پرواں کرنے لگتا، ایک جگہ سے دوسرا۔ ایک شے سے دوسرا۔ زمین اور پانی کے پیچ پیچ اُس کی عجیب بے دھنگی پرواں تھی جس کا ایک سرا دوسرا سے نہ ملتا تھا۔ کہیں کہیں کوئی بازو پہنچ کھولے سلطح آب سے بکھلا ہوتا، قویتی ہوئی آوازیں دھر دھر سے آتیں۔ کہیں پانی صاف ہوتا تو دوسرے پیچے تہہ آب میں عزاب آنکھوں کی زمین پھی ہوتی۔ یہ کون لوگ تھے۔ یہ کون لوگ تھے جن کی آنکھیں دوب چکی ہیں، ہے چشمہ لگائے ایک اسٹر جو چوتھی جماعت کر جس سویں گایاں دیتا ہے، ماں بہن کی، گندمی گندمی، ہر روز صحیح سویرے وہ کام دیکھتا ہے اور اتنے زدہ سے کان ٹردتا ہے کہ کان جڑوں سے بکل آتا ہے اور دینک پکھوشنائی نہیں دیتا۔ وہ آدمی اپنی میز پر جا کھڑا ہوتا ہے جب کہ اُس کی عینک کے شیشوں پر سلاخون والی روشن کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں اور آدمی آدھی آدھی آنکھیں نفرت سے چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں، مذہ اتحاد کر شرمگا ہوں کے گندے گندے نام لے کر گایاں دینے لگتا ہے اور ساتھ ساتھ پانچ میں پنچے ہرے ڈنڈے کو برا میں اور پیچے حرکت دیتا جاتا ہے، کبھی ڈنڈے کو میز پر رکھ کر ہاتھ کا سرکاس لیتا ہے اور دوسرا ہاتھ کہنی میں رکھ کر بے شرمی سے بلاتا ہے۔ پیچے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہیں اور ہر اس کا دیوان کے دل کو جکڑ دیتا ہے۔ اُس کے دانت سفید و انت پیلے چہرے میں سفید دانت جن سے تڑختی ہوئی گایاں بکھلتی ہیں۔ اب اُس کے دانت رہ گئے ہیں، اور پکھو نہیں رہا۔ پیچے کو ایک عورت کے بعد سمجھ آتی ہے کہ یہ غصہ کہاں سے آیا مگر کیا فائدہ، جب کہ ہر اس نے اُس وقت اُس کے دل کو کچڑا بیا تھا اور وہ دانت ویس کے دیں کھنے ہیں، ہے لحاف میں دبکھا ہوا نو سال کا بچہ، درد سے اُس کا کان پھساتا ہے، کان اور سر اور گردن کے پیچے۔ ذاکر غزری، مرٹے دا کمر غزری بابا کے دوست، اُس کا گال تھپتیا تھے ہیں اور کہتے ہیں، داجی دا، کان کے درد سے رہا ہے میرا بیبا ہے روا بھی ٹھیک کر دیتے ہیں، ہش شش، ایسا بہادر بیمار تو ہے، ہے ریا ایک چمچہ پی لو، ایسے۔ بیشا بش، اور ایک تھپتے کان میں، ایسے۔ بیس بیس بیس، لو اب آرام سے سو جاؤ، ٹھیک بہ کن نہ ہے پھر رہے اڑکنی، داجی دا۔ ہاتھ سے ہوا میں پھر رہے اڑنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ جب وہ جلنے کے

یے تڑتے ہیں تو پچھے کارون ایک دم تھم جاتا ہے پہنچو چکے ان کی پسلوں خون سے تر ہے۔ ہیں؟ بابا دیکھو کر
خونک پڑتے ہیں، یہ کیا خوری ہے افٹر رحم کرے۔ ڈاکٹر خود ہی آہستہ سے خون آلوہ پسلوں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور ان
کے رسول کی طرح زرد گال پہلی بار پچھے کی نظر میں آتے ہیں۔ با فضل، وہ اداسی سے بولتے ہیں، بگردنی جا رہی ہے۔
سین گردنی جا رہی ہے، پکے کی سمجھ میں نہیں آتا مگر ان کو عجیب طرح سے نانگیں پھیلا کر چلتے ہوئے دیکھو کر اُس کے دل
میں خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر خوری اب مر جائیں گے، اور وہ دوبارہ رونا شروع کر دیتا ہے۔ اُسے جیاں آتا ہے کہ اُس
کے کان کو کبھی آرام نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر خوری پھر کبھی نظر نہیں آتے، ان کی دکان بند رہتی ہے، جب کھلتی ہے
تو کلپسیں پسلوں کی دکان ہوتی ہے جہاں ایک ڈاکٹری والالہ کامکبل اور ڈکٹر یونچارہ تھا ہے۔ اُس کے کان کو آدم آ
جاتا ہے، مگر اُس کا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ اب رسول کے سے گال اور ہوا میں پھر رے اٹھانے کا اشارہ رہ
گیا ہے۔ زید ریس کی ہوت ٹانگیں پھیلا کر آہستہ چلتی ہے۔ کیوں؟ کیوں؟ ہی نیم خواب کی حالت میں وہ
لیڈا یعنی حیران ہوتا ہے۔ میرا ساتھ سو گیا ہے۔ سر کے نیچے دبا دبا ساتھ سو گیا ہے۔ اسے میں نکال کیوں نہیں
سکتا ہے مجھے علم ہے کہ میں یہاں پڑا ہوں۔ اس بات کا مجھے علم ہے۔ مگر ہی نہیں سکتا۔ کیوں؟ ہیں مر گیا ہوں؟
اکڑا ہوا سیدھا بدن، عبادت کی صورت یا بغاوت کی، سب سے پہلے میں نے مر جھی تھی۔ پھر پھی اُسماں کی شادی
کے میرے دن۔ جان۔ جان محمد۔ اُس کا بھکھے بلکے بالوں والا بڑا خوبصورت چڑھا سا سترھا، اور گہرے بادامی نگہ کا
پھرہ کرنی اُس کو نہ کر ز سمجھتا تھا، بابا کے ساتھ کھیلا ہوا تھا۔ مگر وہ بڑا نہ تھا، جب میرے ساتھ باتیں کرتا تو میرے
جنما ہو جاتا تھا۔ سیڑھیوں کی بغل میں اُس کا کرہ تھا اور جب اور کوئی نہ ہوتا تو میں اُس کے ساتھ کھیلنے کے لیے چل جایا
کرتا۔ دو پھر کوشک کرتی ہرلی بیک بزرگی دھوپ میں میں کھیل رہا تھا اور جان مایا لگی پگڑی باندھے، اچکن پہنے
برات کے مہماں کو شریعت پیش کر رہا تھا۔ یہ میری پہلی شادی تھی۔ میرے دن رکے میری بیوی کھل گئی، سب
سرئے پڑے تھے۔ میں اٹھا جان کے کمرے کو چل دیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک دو دھکتے دینے کے بعد
میں نے درز سے انکھوں کا گار دیکھا۔ اور کچھ اندر حیرا تھا، اور دوسرا بھی نانگیں اور دوپھر ہوا میں لکھ رہے
تھے۔ ایک دو دھکتے اور دیے اور واپس دٹ آیا اور چارپائی پہنچ گیا۔ لگھوں میں صرف چڑیوں کے چھپا نے کی آواز
تھی۔ دن بھل رہا تھا۔ اُس کے بعد میں نے جان کر نہیں دیکھا۔ بابا نے اُھر جانے کو منع کر دیا۔ شام تک بھرم چھٹ
گیا۔ شام کو پھر پھی اُرما اپنے خاوند کے ساتھ آئیں تو نیلی سائز کے بکس میں سُرخ ہونڈ والا اُن کا چڑھا بورھا
لگ کر رہا تھا۔ وہ بھی اُھر نہیں گئیں۔ کچھ دیر کے لیے اپنے کرے میں چل گئیں۔ جب باہر آئیں تو ہنس رہی تھیں،
مگر انکھوں سے پا چلتا تھا کچھ روتنی رہی ہیں۔ پھر نے سے نہ کے چھوٹے سے منہ دلے فوڑا پکڑ۔

پشادر میں ذکر ہیں۔ کون کہتا ہے میرا کوئی پوچھنے والا نہیں ہے ذوالعفاف کو شاید پتا نہیں، میرا کوئی تو ہے۔ مگر ان کو خبر کیسے ہر ہے نہیں، مل بھی نہیں سکتا۔ حالانکہ ہوش میں ہوں، دیکھ رہا ہوں، کوارٹ کی درز میں نکتے ہوئے پیرا ب برف کے اوپر پھیل رہے ہیں۔ کوچک چک۔ گاڑی چل رہی ہے۔ گھر کی بھلی چل گئی ہے۔ رات کو انہوں نے موسم تیکی روشنی میں کھانا کھایا ہے۔ کھانے کے بعد وہ دوسرا موسم بتی جلتا ہے اور ملکوں کی سیر کو چل پڑتا ہے۔ اس کمرے میں کرنی نہیں آتا۔ بھروس پیسوں اور لوٹے پھونے فریچر کے انبار لگئے ہیں۔ کوچک چک چک۔ یہ لاہور ہے۔ لاہور میں چڑھی چڑھی سڑکیں اور بھلی کی تیز تیز روشنیاں ہوتی ہیں۔ بھلکی میں ایک شیشے کا کونا ڈوما ہوا ہے، مگر اس قسم کا زیگین پھول دار شیشہ اب نہیں بلکہ جالتا۔ جاڑوں میں تیر ہوا جب چلتی ہے تو اس موسمی میں سبھی بختی ہے اور دوسرے کمرے میں بچے کی زندگی مل جاتی ہے۔ گاڑی چھوٹ رہی ہے۔ کوود چک چک۔ گرم گرم موسم کے کامنے ہوئے قطرے اس کے پر رستے ہیں اور وہ ٹھہر کر ان کا مزالیتا ہے، باختہ آتا کرے لے موسم کے قطروں سے بجا تا ہے پھر اب تک تو ہذا میں بہرا ہے۔ کوئی مرتوں نہیں گرتا، سب وہیں رہتے ہیں۔ یہ سحر قند ہے، سحر قند میں چور کی کھال کی نوپیاں پہنے روک چائے پیا رہے ہیں، جیسے تصویروں میں میخے ہوتے ہیں۔ غیکن میں۔ یہاں پرانے قابوں میں میں بڑے بڑے سوراخ ہیں جہاں سے چوریں نے کھایا ہے۔ چہے واقعی قابوں کو کھا جاتے ہیں بہی ان کے پیٹ میں درد نہیں ہوتا ہے پیٹ میں ہلاکا درد پھر اٹھ رہا ہے۔ کیا کردن ہے یہاں پر یہاں یہاں محسوس کر رہا ہوں۔ ہوش میں ہوں۔ کوشش کردن تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ وقت پر، اس نے دور سے سوچا، دسترس کیسے حاصل ہوئے۔ شیشے والی میز کی سطح پر گرد کی تہہ بھی ہے۔ گرد فیم کی ہوئی تصویر پر بھی پڑی ہے جو دہان رکھتی ہے۔ تصویر کے آگے گرد میں وہ موسم کے قطروں والی اٹگلی سے لکھتا ہے: آہ۔ ہاہ۔ سحر قند ۱۹۵۲ء۔ اور ایک جالے میں ایک بکھی مری ہرل اٹگی ہے۔ بچے کو پتا ہے وہ نظر اٹھانے کا درمکھی دہان پر ہوگی۔ ہمیشہ ہوتی ہے۔ وہ نظر اٹھا کر دیکھتا ہے۔ بکھی دہان پر اٹگی ہے۔ اس سے کچھ فاسدے پرکڑی بھی چور ہوئی لٹک رہی ہے۔ بکھی کو کھانے سے پسلے ہی کیسے سرگئی ہے پچھ سوچتا ہے۔ شاید جیسا ہو گئی۔ کوچک چک۔ چلو رنگوں چلپیں۔ کوودو چک چک۔ رنگوں سے گزنا آسان کام نہیں۔ یہاں سے گزرنے کا کوئی راست نہیں۔ میزروں اور کرسیوں اور چارپائوں کی چھوٹوں کے پائے سر کو لگتے ہیں۔ مگر ایک دو چھوٹیں بیٹھنے کے لیے جی ہرل ہیں۔ خاص طور پر ایک، جہاں دو کرسیاں ساتھ ساتھ اس طرح رکھتی ہیں کہ چھوٹا سا گھر کیا ہے جس کے اوپر میز کی چھٹت ہے۔ اس گھر کو جانے کا راستہ بھی ہے۔ پسلے شعل کے اوپر کھڑے ہو جاؤ اور دہان سے پیٹی پر گھنڈا کہ کر جو حصہ پھر میٹی پر چلتے ہوئے آدم کر سائیں۔ ہاؤ اور اس کے اوپر پاؤں رکھ کر دوسرا طرف آر جاؤ تو یہ کی ہوتی درجی پڑی

ہے۔ اس پر پاؤں رکھ کر گز جاؤ۔ سامنے گھر ہے۔ صرف اس میں جبکہ کو داخل ہونا پتا ہے۔ پھر ملنے کی صحت ہے۔ سریز کو لگتا ہے۔ ایک دفعہ پڑ جاؤ تو ٹانگیں سیت کر اور گھنسنے پھات سے لگا کر امام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ لگریوں کی دو پھروں کو جب بایا اور پھر جو اور جان سو جاتے ہیں تو اُسے نیند نہیں آتی، پھر وہ بیہاں اگر بیٹھ جاتا ہے۔ اس گھر کے یہیں سامنے دوسری دیوار کے ساتھ ایک اور جگہ ہے جہاں صوفی کے اور پیر میر کھڑی ہے اور بیز کے اور ایک گرسنی جہاں ایک دوپھر کو روشن اُس کے ساتھ پلی آتی ہے۔ وہ گھوڑی بن کر روشن کو اور پڑھتا ہے، پھر جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ شش شش۔ ماتیں کرنے سے بایا جاگ جائیں گے۔ وہ آمنے سامنے بیٹھ باہر فاختہ کے بولنے کی خواہید ادا کر سختے رہتے ہیں۔ پچھلے دیر کے بعد روشن دہاں بیٹھی بیٹھی اگتا جاتی ہے۔ روشن اس سے یہیں سال بڑی ہے۔

”چلو چلپیں۔“ وہ کہتی ہے۔

”مہیں میڈیں۔“

”یہ کوئی جگہ ہے ہے پھر ماتیں کرو۔“

”اوہوں۔ شور ہو گما۔“

”کیا کریں ہے۔“

”لکھوں کی آواز نہیں۔ تم سوچ لیتی ہو ہے۔“

”کیا ہے۔“

”پچھلے بھی۔“

”اوہ۔“ وہ اچک کر کہتی ہے، ”یہ کوئی جگہ ہے؟ بیہاں چوہے ہوں گے۔“

”اوہوں۔ میں روز بیہاں آتا ہوں۔“

”روز ہے۔“

”اں۔“

”کیوں ہے۔“

”یہ بگون ہے۔“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”ملک ہے۔“

”ملک ہے۔“ وہ نہ پہاٹھ رکھ کر جنتی ہے۔

”شورست کر دے۔“ وہ درکر کہتا ہے، ”اصلی ملک ہے：“

”دہاں کیا ہوتا ہے ہے؟“

”اوو۔ درخت۔ بڑی دریں ہے۔“

”بڑی دوسرے تو پھر یہاں کیسے آگئی؟“

”بس یہ زنگون ہے۔“

”مگر یہ تو ملک نہیں۔“

”تمہیں پتا ہے ملک کیا ہوتا ہے؟“

”نم۔“

”کیا ہوتا ہے؟“

”ملک ہے۔ اوو۔ ملک ہوتا ہے۔“

”دیکھا ہے۔ تمہیں پتا رہی نہیں ملک کیا ہوتا ہے؟“

”مگر یہ تو کوہ ہے، اسدی۔“

”ملک بھی ہے۔ وہ کہتا ہے،“ وہ لاہور ہے۔ وہ ستر قند ہے۔ یہ زنگون ہے:

”وہ ایک ہاتھ مٹھ پر ایک پیٹ پر رکھتے ہنسے جاتی ہے۔“ تم تو ہیو قوف ہو، اسدی۔“

پھر وہ کہتی ہے، ”میں ترچل۔“ ”وہ دہیں سے نیچے چھلانگ لگا دیتی ہے۔ کُسی نیز پر اندھی ہو جاتی ہے مگر گرتی نہیں، پھر ایک سیکنڈ کے بعد رُچک کر گر جاتی ہے۔ شور سارے مکان میں گوشخواہ تھا ہے۔ روشن اُرٹی ہوئی کرسے بھل کر غائب ہو جاتی ہے۔ وہ بیٹی سے اُتر رہا ہے کہ بلاسٹر خ انگھیں ملتے ہوئے دروانے پر دکھائی دیتے ہیں۔ پتھے، تم سوتے کیوں نہیں؟ تمہیں نیند کیوں نہیں آتی؟ ہو گو وہ چھک چھک۔۔۔

روشن کی کالی انگھیں ہیں جنہیں وہ ہر دقت پھیل کر کرتی ہے۔ پھر ایک روز روشن کمیں چل جاتی ہے۔ بابا، روشن کہاں چل گئی ہے؟ وہ پوچھتا ہے۔ روشن اپنے شترداروں کے ہاں گئی ہے، وہ صرف شہر میں۔ کون سے شہر میں نہارا کرنی مطلب نہیں، بابا سختی سے منع کر دیتے ہیں۔ روشن اب چل گئی ہے۔ روشن پھر نظر نہیں آتی۔ سر ملوں کی شام ہے اور روشن کے پر کھلے کھلے چاند بھل آیا ہے۔ سب نے کچھ نہیں پڑنے پر اپنے اپنے گھر دل کو جا چکے ہیں۔ وہ دونوں دہاں کھڑے رہ جلتے ہیں۔ وہ اُسے گھر سے نگایتی ہے، اچانک مٹڑ پر جم کر گرم گھنکھوں سے بنتی ہے، پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر پسے یعنی پر کھلیتی ہے۔ اُسے سمجھ نہیں آتی۔ دکھاؤں؟ وہ پوچھتی ہے

وہاں میں سر ٹلاتا ہے۔ روشن پانچ سوئے قیعنی کھینچ کر اور انخادتی ہے۔ دیکھا؟ اوپر، وہ نقی میں سر ٹلاتا ہے۔ قیعنی کو اور اور پر
کھینچنی ہے اور چانکی طرف فڑ کر کے کھنڈی ہو جاتی ہے۔ روشن کی دونوں کھنڈیاں رچنے کے کئے ہوئے پرول کی مانند ہوایں اُنھیں ہیں۔ اس
کے سینے پر ساتھ ساتھ مدنی ہوئی فدا فدا اُبھری ہوئی جھیلیں ہوئیں کہ پورا گلابی ننگ کے چڑھنے ہیں۔ روشن اُس کا ہاتھ پر بُرد
کر ایک کے اور پر کھو دیتی ہے۔ وہ انگلیوں کے پوروں کو اہستہ سے چنان پر دباتا ہے، تھے ہوئے کہ شستہ میں بچھوٹے
چھوٹے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ وہ ہاتھ اٹھاتا ہے تو جلد پھر تن جاتی ہے۔ روشن اُنھیں جھیک پ جھیک کر خاموشی سے
بُنتی ہے۔ ابھی پسلے تو نہیں تھے، وہ دل میں حیران ہوتا ہے۔ کہاں سے آگئے ہے اُس کا ما تھے بے اختیار اپنی
چھائی پر جاتا ہے۔ سیدھی اور سپاٹ! دونوں خوشی سے ہفتے ہیں۔ پھر کیسے وہ ایک روز کرنی بات کیسے بغیر
کسی کے ساتھ بجا گک جاتی ہے اب کبھی واپس نہیں آتی ہے۔ ایک عرصہ گز جاتا ہے تو اُسے پتا چلتا ہے کہ کیسے، مگر کیا فائدہ،
چانکی روشنی میں روشن کی کالی کالی جیپکشی ہوئی اُنھیں وہیں ہیں اور وہ میں اُس کے جانے کا احساس رکھیا ہے۔۔۔

۔۔۔ وہ بُر رخاکسار ہمارے سکول کے ساتھ رہتا تھا ایک کرے میں اور خاکی شلوار قیعنی پہنے دن بھر اپنی
سائیکل یہے بازاروں میں پھرنا رہتا تھا اور اُس کی سائیکل کے آگے ہیڈل پر ایک شیشے کے ڈھکنے والا لکڑی کا کمیں
دشکار رہتا تھا جس کے اندر چند پرانی عینکیں کیلوں پر ٹنگی ہوتی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی چشم ساز ذم کا ایکجھہ ہے۔
مگر وہ کبھی عینکیں نیچنے کی آواز نہ لگاتا تھا اور نہ کبھی رُک کر کسی سے عینکوں کی بات کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے
میں ایکجھہ ہو گر بعده میں انہوں نے نکال دیا ہو اور وہ عینکوں کا کمیں اپنی سائیکل سے آتا ہے مجھوں گیا ہو۔ اُس
کمیں کی لکڑی پر اپنی ہو کر درجگ ہر چکی تھی اور شیشے کا ڈھکنے کھیلوں کی ہٹریں سے گدلا ہو گیا تھا اور ایک کرنے سے
ذرا سائٹا ہوا تھا۔ دن بھر وہ خاکسار جواب نیک طرح کا خاکسار بھی رہتا تھا بلکہ پسلے کبھی خاکسار رہتا تھا خاکساروں کی
دردی پہنچے سائیکل یہے بازاروں میں گھوستا رہتا تھا اور ہر دس پندرہ بیس منٹ کے بعد رُک کر اُوچھی آواز میں ایک
نورہ لگاتا تھا؛ چور اچکے چودھری تے لئڈی رن پر دھان۔ ٹاؤر پھر حلپ دیتا تھا اور شہر کے سب لوگ اُسے جانتے
تھے اور کوئی اُس کے فرے کی طرف توجہ نہ دیتا تھا مگر کئی لوگ اُس کے دوست تھے اور خوش ملنے سے اُس کا حال احوال
پوچھا کرتے تھے، صرف کبھی کچار کوئی دیہاتی بازار سے گزتا ہوا اُس کا فرہ سن کر رُک جاتا تھا اور تعجب سے اُسے
ریکھنے لگتا تھا۔ پھر ایک روز اُس کو پیس کر کر لے گئی اور ہمارے سکول کے ساتھ اُس کے کرے پر مالا پڑ گیا۔۔۔

رات کو ایک دھکا لاتا ہے اور وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے بستر گلپا پانی ہے، وہ سہم جاتا ہے، ابھی آواز
آئے گی، پھر اُپر کر دیا، اسدی ہے میں سال کے ہو گئے ہو تھیں پتا نہیں چلتا، اسدی ہے ہیں ہے آواز نہیں آتی۔

وہ ہاتھ پھیلاتا ہے۔ بستر خالی ہے۔ وہ رونے لگتا ہے، کوئی نہیں آتا۔ وہ چارپائی سے اُٹر کر ٹھنڈے فرش پر چلنے

گناہ ہے، پاؤں کو سردی کا نتی ہے۔ دُورے کرے سے اُدازیں آرہی ہیں۔ وہ جاکر دروازہ کھونتا ہے تو تیز روشنی
 اُس کی انگھوں پر ٹرتی ہے۔ وہ انگھیں پچھ لیتا ہے اور بند انگھوں میں کچنے ہوتے منظر کو دیکھتا ہے۔ فرش پر کوئی نشگے
 جن نہیں ہے، تمنہ و ہماری نہیں دیتا، کسی کی کامے باہم والی انگھیں پچھ میلے تھیں، جیسے چھاکی مانگھیں ہوں، صرف ایک
 چھائی ہے جو ڈھنک کر خون میں ڈوب گئی ہے۔ باہکے ااتھ میں بندوق ہے۔ ان کو سردی نہیں لگتی؟ پھرچھوکی
 بیچنے مار کر نہیں سے زمین سے چپک ریتی ہے اور انھا کا پرانے کرے کر بھاگ جاتی ہے۔ اب وہ پھرچھوکے ساتھ سڑا ہے
 مگر نہیں نہیں آتی، انگھیں بند کرتا ہے تو بندوق در دانے میں کھڑی ہوتی ہے اور پستر گیلا پانی — میرے
 چادر طرف پانی ہے۔ اب چھنڈوں کی اواز رُک گئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہاں پڑا ہوں، فرش پر پڑا ہوں اور میرے
 کمر اور ایک ٹانگ گیل ہرگئی ہے۔ میں خواب میں نہیں ہوں، سوتھ سکتا ہوں، سونگھ سکتا ہوں۔ یہ کیسی بوہے فضیلے
 کے تعفین کی بُرتو نہیں، عجیب سی بوہے پہلے کبھی نہیں سوتھی، سردی بوہے، سرواد مکروہ۔ میرے حواس قائم ہیں۔
 انھنے کی کوشش کر دی، کوشش کر دی تو اٹھ سکتا ہوں۔ اُس نے یہی لیٹے سردا سا اٹھایا، پھر فرش پر رکھ دیا۔
 میں بخش میں ہوں۔ ان میں سے کچھ تو خواب ہیں، کچھ حقیقت۔ کچھ خواب جو اتنی بار آئے کہ حقیقت معلوم ہوتے
 ہیں۔ کچھ واقعات جو پرانے ہو کر خواب بن گئے ہیں۔ اب ان میں تینی کرنا مشکل ہرگیا ہے، مگر میں نہ ہوں ہنسنے
 بے انتہا طانیت سے سرچا۔ اب وہ پُرسے ہوش میں تھا۔ وقت کے کندھے پر، اُس نے سوچا، میرا ااتھ تھا۔
 پھسل گیا ہے۔

پھر دہ خواب میں چلا گیا۔ خواب میں جگد جگریا سہیں کے چہرے گردش کر رہے تھے، اور عجب میں دُورہ
 دُرتک، ریس سرزیں پر ایک شیر کا نخا سا سایلمبی زندیں بھرتا تھا۔



دن چھٹے جب تھانیدار کو خڑکی میں داخل ہوا تو تعفین کا نئے دار جباری کی طرح اُدا ہوا اکر اُس کے تمنہ پر
 لگا۔ اُس نے ااتھ سے اپنی ناک دھانپ ل۔ لاٹیں کی رثیتی میں انہوں نے قیدی کو اس حالت میں پایا کہ وہ دیوار

کے ساتھ نہیں دراز، ڈھیر ہوا پڑا ہے۔ اُس کا سر ایک طرف کو ڈھنک گیا تھا اور کندھے دیوار کے ساتھ لگئے تھے، اور اُس کا فصلہ اُس کے چاروں طرف زمین پر پھر رہا تھا۔ رات کو کسی وقت اُس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ مسترد بارکی ہے۔ اُس کی ٹانگیں اور پیٹ فضلے میں لمحڑے ہوئے تھے۔ تھانیدار کے چہرے پر بخت ناگواری کے آثار پیدا ہوئے۔ اُس نے قیدی کو ٹھوک کر کاٹنے کے واسطے پاؤں اٹھایا، مگر کراحت کے مارے کھینچ لیا۔ معاً تھانیدار کا ہاتھ ناک سے ڈھنک گیا اور وہ جک کر بغور اُس بے جان شدید کو دیکھنے لگا۔ اُس کی ہاتھوں میں ایک انگانے سے خوف کے آثار نوادر ہوئے۔ قیدی کا انگ ک بدی کی طرح زرد تھا اور اُس کے چہرے پر زندگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ اُس کے ہونٹوں کے کنوں سے رال کے قطرے بپر کر ڈال جی کے بالوں پر ایک ہوئے تھے۔ اُس کے سینے میں سانس کی جذبیتک ملکی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جان سارے بدن سے اہستہ آہستہ کھینچتی ہوئی آخرا بیک ہاتھ تک اپنی تھی کئی منٹ تک تھانیدار متین کھڑا قیدی کے دہنے باقاعدہ پر نظریں گائے رہا جو اپنے بدن سے انگ تھنگلے ہل رہا تھا۔ اُس ہاتھ میں ایک کز دری، لرزتی ہوئی میکانی حرکت تھی جس سے وہ اپنی زنجیر کے بلکہ جھنکے دے رہا تھا، جیسے کہہ رہا ہو، میں ابھی ذرا ہوں، مجھے چھوڑ دو۔ اُس عجیب الخلقت عمل کر دیکھتے دیکھتے دفعاً تھانیدار کے چہرے پر ناگواری کے ساتھ ساتھ، پوکھلاہٹ کے آثار نوادر ہونے لگے۔ اُس نے ناک پر ہاتھ رکھا اور کچھ بے بغیر، تیزی سے بڑھ کر باہر نکل گیا۔ لاںیں دالا پسہی کچھ دیتک بکھر قیدی کو اور اُس کے اس پاس کی زمین کو دیکھا رہا۔ جب وہ باہر نکلا تو تھانیدار اسی طرح ناک پر ہاتھ رکھتے کھڑا تھا، اور وہ پسہی لحاف کا پرده دیوار سے آتا ہے میں صرف تھے۔

(۶)

جب اسد نے انگھیں کھول میں تر دہ ایک روشن اور ہوا در کمرے میں چار پائی پہ لیا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو اُس سے بتر کی صاف سخن ہی چاہو روکھائی دی۔ دو چھاتی تک ایک شوخ سرخ رنگ کے کبل سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس آرام دہ اور گرم بستر میں وہ کئی منت تک ساکت پڑا رہا۔

پسند دخود کی خبر اسے تہہ آپ پہ ہوئی تھی۔ کانوں میں گھرے پانی کی سُن کی کیفیت والی جھپٹ اور سر سراہٹ کی آواز تھی، جیسے آہستہ آہستہ — بہت آہستہ آہستہ — دُنیا کے محور سے نکل کر میدان میں آہے ہوں۔ ہوش میں آکر وہ کتنی ہی دیر تک انگھیں بنسپے دیکھا رہا۔ میدان میں ہیچ کر انگھیں کھولنے کی اُسے ہمت نہ ہوئی۔ جب اس نے انگھیں کھول میں تو پہلا شخص جس پہ اُس کی نظر پڑی، ذوالغفار تھا۔ ذوالغفار کے میں داخل ہوا اور چار پائی کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ اسد نے آٹھ کر میٹھے کی کوشش کی مگر ذوالغفار نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے بُسا دیا۔

پیٹھے لیٹھے اس نے اپنی ٹانگیں اور بازو ہلا کئے۔

"میں آزاد ہوں ہے" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل" ذوالغفار نے کہا، "آزاد ہو۔"

"میکے ہے"

ذوالغفار نے ہاتھ ہوا میں اٹھایا اور مسکرا کر جگی بجاںی : "ایے"

اسد نے کبیل ہسا کر اپنے ہاتھ اور پاؤں کو دیکھا۔ اُس کی کلامی اور شخصیت پر سیاہ زنگ کے متعدد حلقوں موجود تھے۔ مگر ان میں رنجیریں و تھیں۔ وہ آزاد تھے۔ اُس وقت پہلی بار اسد کو حقیقتاً آزادی کا احکام اُس درم شدہ بزرگ چند کو دیکھ کر ہوا۔ اُس کا دل بکارگی حلق کی جانب پہنچا۔ اُس کی نظریں دروازے پر گئیں۔ در دا تھے اور پینے آسان کی چمک آن پر پڑ رہی تھی۔ اسد ہاتھ سے آہستہ آہستہ دل کے اور پریستے کرنے لگا۔

ذوالغفار آگے چمک کر بولا: "اب تم بالکل آزاد ہو"

"میں کہاں پر ہوں ہے" اسد نے پوچھا، "یہ کس کا گھر ہے ہے"

"اپنا ہی ہے"

"اپ کا گھر ہے ہے"

"یرے یک جانے والے کا ہے" ذوالغفار نے کہا، "جب تمہیں رہا کیا گیا تو تم بیویو شی کی حالت میں تھے"۔

"کتنی دیر ہو گئی ہے ہے"

"دو روز"

"مجھے پرسوں رہا کیا گیا تھا ہے"

"ہاں۔ پہلے روز تمہیں کافی تیر بخارا تھا۔ داکڑ کی دوائی سے لگکے روز بخارا تو اُتر گیا مگر بیویو شی قائم رہی۔ داکڑ اس کی وجہ صرف صدر اور کمزوری بتاتا ہے۔ نکر کی کرنی بات نہیں۔ چند روز آرام کرنے سے تند رسمت ہو جاؤ گے"۔ اسد نے پیالی پر نگاہ دوائی جس پر بزری ماملہ شیشے کی دو تکمیلیں پڑی تھیں جن پر کاغذ کی تاثیرہ خوارکوں کے قشان چکپے تھے۔ بوتوں کے پاس دو ہے کے گلاس پڑے تھے۔ اُس نے چھاتی سے کبیل اٹھا کر ایک لمبا سانس لیا۔ اُس کا جسم پے بُر تھا۔

"مجھے صاف کس نے کیا ہے" اسد نے جھگکتے ہوئے پوچھا۔

"تحانے میں" ذوالغفار نے بتایا، "یکلے کٹڑے سے بد کراچی طرح صاف کر دیا گیا ہے۔ تمہارے

پڑے بھی وہیں پر دھو دیے گئے ہیں۔ پہنچی بھی بدال گئی۔ زخم اب تقریباً بھر چکا ہے۔
اس نے ہاتھ اٹھا کر مانچے کے زخم کو چھوڑا۔ وہیں رہا کیسے ہوا ہے اُس نے پوچھا۔

”ابھی آرام کرو۔ پھر بات کریں گے۔“

”مگر میں پھر چھوڑا کیسے ہے؟“

”مزدہ تغییر کے نتیجے کے طور پر ایک اور گرفتاری عمل میں آئی ہے۔“

”کون گرفتار ہوا ہے؟“

”ایک شخص ہے۔ گشاد سے تعلق نہیں رکھتا۔ جنگلات میں کھڑا تھا۔“

”کیا نام ہے؟“

”نام مجھے معلوم نہیں۔“

”کس کی گواہی پر گرفتار ہوا ہے پاک اس نے پوچھا، کوئی ثبوت ملا ہے؟“

”تفصیلات مجھے معلوم نہیں۔ مُساہے اُس نے اقبال جرم کر دیا ہے۔“

”ثبوت کیا ملا ہے؟“

”دیکھو، ذوالغفار اُس کے کندھے پہاڑ کر کر بولا۔“ داکڑ نے کہا ہے تمہیں ابھی مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ ان ہاتوں سے دارخ کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہت وقت پڑا ہے۔

”آزاد قتل برآمد ہو گیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

” غالباً ہو گیا ہے۔“

”کیا ہے، چاقو ہے؟“

ذوالغفار اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تمہاری ہاتوں سے تو مسلم ہوتا ہے اُس کی دکالت کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔“ وہ بولا۔

اُس کے جانے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اُس کی سانس پھوٹل گئی ہے۔ چند منٹ کی گش਼کر سے ہی اُس کے سینے میں بلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا۔ وہ ہمچیں بندیکے بستر پر ڈپا رہا۔ جب ذوالغفار بخینی کا پایا اور ساتھ دوسرا لے کر آیا تو پسالے میں اُس پتھے سے شور بے کو دیکھو کر دیکھا۔ اس نے پھیر لیا۔ مگر بخینی کی خوبصورتی کے اپنے شوکے ہوئے بن کے گوشہں تک پھیل ہوئی لاکھوں سمجھی تھی شرماں میں قوت اور حرارت کو سراہت کرتے

بُرے محسوس کیا۔ سمجھنی ختم کرتے ہی اُس پر نقاہت کی نیند طاری ہو گئی۔ لگھری نیند میں جانے سے پہلے اُس نے ذوالغفار کی آواز سنی، ”در در تک پچھے سے مشکل کچھ خدا کی اندر جاسکی ہے۔ اب تھیک طرح کھاؤ گے تو طاقت آجسٹے گی۔“

خواب میں اُس نے دیکھا کہ اُس کے دلوں ہاتھوں میں ماسور کی قسم کے رخم پیدا ہو گئے ہیں جو بس رہے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے ہاتھ بھر کر نیچے گزپتے ہیں۔ اُسے درد کا احساس قطعاً نہیں ہوتا، مگر اُس کے دل میں ایک ناقابلِ تلافی نقصان کا ہول پیدا ہوتا ہے — اس ہول سے چونک کردہ جاگ پڑا، مگر چند ہی لمحے بعد نیند نے دوبارہ اُس پر غلبہ پالیا۔ اُس مختصر سے ہر سے میں، جب وہ جاماتھا، اُس نے محسوس کیا کہ اُس نے وہ بوئنگھی ہے جو ایک بار پسلے نیم خواب کی حالت میں سونگھی تھی اور پرشیان ہرگیا تھا، کیونکہ ایسی بُرا اُس نے پہلے کم جھی نہ سونگھی تھی، سرد سی تو، جو شاید صوت کی بُرتھی۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو ان دھل چکا تھا۔ اُس گرم بستر میں اپنے آپ کو اسودگی سے یہ نہ پاک کر اسکر اچانک بے انتہا طائفت کا احساس ہوا، جیسے ایک بار پھر کے فرش پر یہ نہ پاک کر منظرِ دکھائی دینے لگتے تھے اور اسے خیال ہوا تھا کہ وہ مر جا کر ہے۔ پھر تھوڑی دریکے بعد منظرِ دکھائی دینے پسند ہو گئے تھے اور اُس کو پتا چلا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اب خواب اُس کا دل دہلاتے تھے۔ ذوالغفار اُس کے لیے سمجھی کا بھرا ہوا پیالہ اور موٹی سی زرم خیری روٹی لے کر آیا۔ اب ایک مستقل بجوک اُس کے پیٹ میں پیدا ہر چلی تھی۔ سمجھی کے ساتھ روٹی کھتے ہوئے اُس نے شاہ رُخ کے بارے میں پُرچا۔

”چھٹی سے واپس آگیا ہے۔“ ذوالغفار نے کہا، ”کل اور پرسوں دونوں دن آتا رہا ہے۔ الجھی شاید اگے گا۔“

ذوالغفار کر سی پڑھتا اور ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا کہ شاہ رُخ آپنچا۔ اسکو بستر پر آنکھ کر دیجئے ہوئے دیکھ کر اُس کا چہرہ بھل آئتا۔ اُس نے گرجوشی سے اسکے ساتھ ہاتھ لایا اور دریک دلوں ہاتھوں میں اُس کا اتحاد پکڑے زور زور سے ہلکا اور اُس کے چہرے پر نظریں جائے خاموشی سے ہنسا رہا۔ پھر وہ اُس کے پاس ہی چار پانی پر بیٹھ گیا۔

”تم کس صیبت میں بچنس گئے تھے ہے؟ وہ ہنس کر بولا، ”میرے واپس آنے تک تو رُک گئے ہوتے۔“ پھر وہ خود ہی اپنی بات پرشیان سا ہو کر خاموشی سے اسکو دیکھنے لگا۔ ”تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

اسد دروازے سے باہر شام کے اڈھیرے کو دیکھ رہا تھا۔ ”اے۔“ اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔

شاہ رُخ نے ذوالغفار کی خیریت دریافت کی۔

”شاہ رُخ“، پچھر دیر باتیں کرنے کے بعد اسد نے کہا، ”وہ کثر جو کہا گیا ہے؟“
”ماں۔“

”کون ہے ہے؟“

”تھا۔“ شاہ رُخ نے کہا، ”پچھلے سال نکال دیا گیا تھا، چوری میں۔“

”کرن ہے ہے؟“

”خوشی محمد۔“ شاہ رُخ نے کہا، ”بایع نہ کہے۔“

”خوشی محمد!“ اسد حیرت سے تقریباً چلا آٹھا، ”میں اُسے جانتا ہوں۔“

”ماں۔ یہ شخص عادی چور ہے۔“

ذوالغفار نے بخوبی کا خالی پسالہ اور تھوڑی سی بچی ہوئی روٹی اٹھانی اور باہر نکل گیا۔

”مگر حکیم کے ساتھ اُس کے پڑائے تعلقات تھے۔“ اسد نے کہا، ”زیادہ تر جریبی بُوٹیاں تو وہی سرحد پر سے لاکر حکیم کو پلانی کیا کرتا تھا ہے؟“

”ماں۔ حکیم کے فتنے اُس کے پچھے بھی لفایا تھے۔ مگر چور کے لیے کوئی وجہ ہوتی ہے؟ اس علاقے میں زیادہ تر چوریاں اپنے بی آدمیوں کے ہاتھوں ہوتی ہیں، اور عجموماً پُرانے تعلقات رکھنے والے کرتے ہیں؛“
”مگر خوشی محمد کے لیے تو چوری کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر اُس کے پیسے حکیم کی طرف نکلتے تھے تو چوری کرنے کا کیا مطلب ہے کرنی ہی تھی تو اپنے پیسے دھوکہ کرنے کے بعد کرتا ماوراء الرحم کیا کہ وہ چوری کرنے ہی آیا ہے تو حکیم کو قتل کر دینے سے تو اُسے کچھ بھی نہیں ملتا۔“ اسد نے آہتہ سے سر کو لنپی میں ہلایا، ”میں نہیں مانتا۔“

شاہ رُخ ملکشی باندھے اس کو دیکھا رہا۔ اُس وقت پہلی بار شاہ رُخ کو احساس ہوا کہ یہ شخص، اسد، جس کے ساتھ اُس کی گہری راقیت رہی تھی، وہ شخص نہیں تھا جسے وہ چند روز پہلے گشید ہیں چھوڑ کر چھٹی پر گیا تھا۔
گو اُس کی دوستاد مسکراہٹ اُسی طرح بے ساختہ تھی، اُس کی باتوں کا رُخ، اُس کی انگھوں کی عجیب سی جندی نرم خود وہ ششکل مختلف تھی۔ اس چند روز کے عرصے میں وہ بدل گیا تھا۔

”قتل کی داروات،“ شاہ رُخ نے کہا، ”ڈیر ہی سی چیز ہے۔ بُہت کم قتل ایسے ہوتے ہیں جو سب سے سادے واقعات پر جیلو رکھتے ہیں۔ خوشی محمد کے بارے میں وہ باتیں اس وقت کم دیش یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چوری کی نیت سے آیا تھا۔ دوسری کہ اُس کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ چوری کی نیت سے

لے کر قتل کی داردات تک کا درسیاں علاقوں نامعلوم ہے۔ کس نے پہلے حملہ کیا، کیوں کمر کیا ہے ان باتوں کا تین تفییش سے ہو گا۔

”قتل کی شہادت کیا ہے؟“
”آزاد قتل۔“

”برآمد ہو گیا ہے؟“
”ہاں۔“

”کیا ہے؟“ اسدے بے صبری سے پوچھا، ”چاف ہے؟“
”ہاں۔“

”پھلی کی شکل کے دستے والا ہے۔ قتل کے دستے والا جس میں زنگ برلنگر پھر جو ہے ہوتے ہیں ہے؟“

”مجھے خبر نہیں۔“ شاہ رُخ حیرت سے بولا، ”تمہیں کیسے خبر ہے؟“

”اس شکل کا ایک چاؤ آزاد قتل کے نام سے میرے سرمنڈھا جاتا رہا ہے۔“

”جو ہمچیاں برآمد ہوا ہے بہر حال حملی ہی معلوم ہڑا ہے۔“

”کیسے؟ تہیں کیسے تین ہے؟“

شاہ رُخ نے ان بھلکی ہوئی، بضیدِ انگھوں میں پھر اس انتہا اجنبیت کی جگہ دیکھی۔

”اول اُس کے گھر سے برآمد ہوا ہے۔ دوم اُس پر انسانی خون موجود تھا۔ سوم زخم کی شکل و صورت اور

نوعیت اس سے میل کھاتی ہے کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی۔“

ابھی ابھی، اسدے سوچا، اس نے کہا تھا قتل ایک ٹیڑھی سی چیز ہے۔ وہ بھلکی ہوئی، خالی خالی انگھوں سے شاہ رُخ کو دیکھتا رہا۔ پہلے اتنا اسرار، پھر اتنی سادگی! یہ لوگ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ مجھے ان کی سمجھ کیوں نہیں آتی۔ میں ان لوگوں کی بالوں سے کیسے ایک دم انساً دوڑ ہرگیا ہوں ہے۔ اسدے محسوس کیا کہ اب وہ پہلے کی طرح واقعات کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر کسی یہدی سے سادے تسلی بخش نتیجے پر پہنچنے سے ڈھر جوڑ چکا تھا۔ یہ نہیں کہ کھنچی تو سبھائے کی اُس کے اندر خواہش نہ رہی تھی۔ مگر حالات پر اور واقعات کی ظاہری شکل پر اُس کا انعام اُنھوں کی تھا۔

”خوشی محمد کو تم نے پڑ دیا ہے؟“ اسدے پوچھا۔

”اوہہوں۔“ شاہ رُخ نے لفی میں سر لایا، اُس کے بھائی بدوں نے ہی بخوبی کی تھی۔ بخوبی میرے

یہک پہنچی، بیل نے آگے بڑھا دی۔ میرا اس میں اتنا بھی حصہ ہے۔"

ذوالقدر نے دروازے سے اندر جانکا، جیسے کسی چیز کی تلاش میں ہو۔ میر پر اپنی سگریٹ کی ڈبیا و کچھ کر اندر چلا آیا۔ کوئی سمجھ کر اس نے یہک سگریٹ سُلکایا اور ڈبیا جیب میں ڈال لی۔ اس کے سر پر بالوں کی فصل اس شکل میں آگئی تھی جیسے اس نے ملکے زنج کی لوپی پہن رکھی ہو۔

"میرا خیال ہے،" وہ کشے کر بولا، "تم اب آرام کر دو۔"

"میں اب تھیک ہوں،" اسد نے کہا۔

"واہ۔" وہ مہنس کر بولا، "بتر پر اٹھ کر مجھے سے تھیک ہو گئے ہو، تمہیں کم از کم دو چار دن اور خدا کی اور آرام کی ضرورت ہے۔" ذوالقدر اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔" اس نے شاہ رخ سے کہا اور باہر نکل گیا۔

باہر نکلتے نکلتے ذوالقدر نے دروازہ بھیڑ دیا۔ رات کی روشنی اسد کی نظر سے اوچھل ہو گئی۔ دروازہ بند ہوتے دیکھ کر اس کا دل دفعتہ سکڑنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ شاہ رخ سے کہے، دروازہ کھول دو۔ مگر باہر پہنچنے کی رات یہک دم سرد ہو گئی تھی۔ اسد بتر پر اکڑنے پڑا دروازے کو گھوڑتا رہا۔

"شاہ رخ،" اس نے پوچھا، "ذوالقدر کو تم کتنی دیر سے جانتے ہو؟"

"چند مجھنے سے، تم تو اس کے پرانے واقعہ ہو۔"

"میر سے ساتھ دالے گاؤں کا رہنے والا ہے۔" اسد نے کہا، "یہ اس کا سرکاری مکان ہے؟"

"نہیں۔ یہک کشمیری کا ہے۔"

"یہ کیا کام کرتا ہے؟"

"سرکاری ملازم ہے۔"

"سرکاری ملازم تو تم بھی ہو۔" اسد نے کہا، "یہک قسم کا سرکاری ملازم ہے؟"

"تمہیں نہیں پتا ہے، شاہ رخ مگر اکر بولا۔"

"نہیں۔"

"تمہارے ساتھ اس کی ملاقات تو ہو چکی ہے۔"

"یہک بار حوالات میں ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا پرسیں میں ہو، کہنے لگا نہیں، سرکاری ملازم ہوں۔"

پچھوڑی کے بعد شاہ رخ نے جواب دیا: "غائب نوج کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ تھیک سے مجھے بھی علم نہیں۔"

”پولیس کے ساتھ اس کا اثر رُخ کیسے ہے؟“

” تھانیدار لکیم اشٹخاں کے ساتھ اس کا اچھا میل جوں ہے۔ دیسے اس علاقے میں فوج اور پولیس کا آپس میں کچھ نہ کچھ تعلق رہتا ہی ہے۔ یہاں کا بہت سارا کاروبار فوج کے دم پڑتا ہے۔ درج فوج کی آمد سے اس علاقے کے لوگوں کی مالی حالت کافی بہتر ہو گئی ہے۔ چنانچہ انتظامیہ کے کاموں میں فوج کا تھوڑا بہت دخل قدری اور ہے۔“

” ہوں۔“ اسد ڈھوڑی گھٹنؤں پر کتنے دروازے کو گھوڑتا رہا۔ ” مجھے یہاں کیوں لے آیا ہے؟ پھر اس نے کہا۔

” جب میں چھٹی سے واپس آیا تو اس نے تمہارے بارے میں سیرے ساتھ بات کی تھی۔ یہ رے خیال میں تمہارے ساتھ اسے دیسے ہی ہمدردی ہو گئی ہے۔ کومی دل کا اچھا ہے۔ فوج میں ہونے کے باوجود بہت بُذیاتی اور مخلص شخص ہے۔ پڑھا لکھا آدمی ہے۔“

” مل۔“ اسد نے کہا، ” یہاں کیوں لے آیا ہے؟“

شاد رُخ کرے میں اوھر اور صدیک یعنی لگا۔ ” سب سے مناسب جگہ غالباً یہی تھی۔“ وہ بولا۔

” مناسب جگہ سے کیا مطلب ہے؟“

شاد رُخ نے جواب دینے سے احتراز کیا۔ جب اسد نے اپنا سوال ڈھرا دیا، تو بولا: ” میں نے پورنی کوشش کر تھی کہ تمہیں بُلگئے لے جاؤ۔ مگر پولیس نے احتراز لگا دیا۔“

” کیسا احتراز ہے؟“

” اُن کے خیال میں گشاد کے علاقے میں تمہارا جانا مناسب نہیں۔“

” کس کے خیال میں؟ تھانیدار کے؟“

” پولیس کے خیال میں۔“ شاد رُخ نے کہا۔

” کیوں؟“

” نقیض امن۔“

” نقیض امن؟ اسد بولا۔“ میں جرام پیشہ آدمی ہوں ہے شخصہ اس کے دامنخواہ اندھی کی طرح چڑھا۔

” جرام پیشہ میں ہوں یاد ہیں ہے جو بے گنا ہوں کوچک کر کے ان پر گشاد کرتے ہیں؟“

” وہ کئی لمحوں تک ابلیس ہوں گھوڑے سے جواب طلب کرتا رہا۔ شاد رُخ نے خاموشی سے بھتیں اور کندھے